انتخاباتِ میر و غالب

نصابِ لازمی برائے انٹرمیڈیٹ

(حقوق محفوظ)

(حقوق محفوظ)

ترمیم شدہ
(دوسرا اڈیشن)
۱۹۵۳ء

ترمیم شدہ
(دوسرا اڈیشن)
۱۹۵۳ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مُرتبہ: شعبۂ اُردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مع حواشی و سوانح و تبصرۂ شعراء

سید ظہیر الدین علوی ایم اے لیکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ناشر
ایجوکیشنل بک ہاؤس
سول لائن حامد بلڈنگ (یونیورسٹی ایریا) علی گڑھ

انتخابات
میر و غالب

شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مع حواشی و سوانح و تبصرہ شعرائے

از

سید ظہیر الدین علوی ایم اے لیکچرار شعبہ اردو

قیمت ۹/

ملنے کا پتہ

ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن حامد بلڈنگ۔ علی گڑھ

فہرست

٧٨٦

غزلیاتِ میرؔ

(١)

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں
جہاں کو کہاں تک ڈبوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کا بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

(٢)

سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا
پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

کروگے یاد باتیں تو کہوگے
کہ کوئی رفتۂ بسیار گو تھا

جہاں پر ہے فسانے سے ہمارے
دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

نگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا
کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

کہیں کیا بال تیرے کھل گئے تھے
کہ جھونکا باد کا کچھ مشک بو تھا

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

(۳)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونس ہجراں
سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہے شرط ارنہ[۱]
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بلب نہیں آتا

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

(۴)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

لہ۔ ارنہ یعنی ورنہ۔

سنتے ہیں لیلےٰ کے خیمہ کو سیاہ
اس میں مجنوں کا وسے ماتم رہا

جامۂ احرام[1] زاہد پہ نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

اس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
اپنے حق میں آب حیواں[2] سم[3] رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

(۵)

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

دل مجھے اس گلی میں لے جاکر
اور بھی خاک میں ملا لایا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(۶)

نالہ مرا اگر سبب شور و شر نہ ہو
پھر مر بھی جائیے تو کسو کو خبر نہ ہو

[1] جامۂ احرام۔ وہ کپڑے جو حج کرتے وقت پہنے جاتے ہیں، مراد پاکی ہے۔ [2] آب حیواں۔ مراد آب حیات۔ [3] سم۔ زہر

دل پہ ہوا سو آہ کے صدمے سے ہو چکا
ڈرتا ہوں یہ کہ اب کہیں ٹکڑے جگر نہ ہو

برچھی سی پار عرش کی گزری بعاقبت
آہِ سحر میں میری کہاں تک اثر نہ ہو

سمجھا ہوں تیری آنکھ چھپانے سے خوش نگاہ
ہر نظر یہ ہے کہ کسی کی نظر نہ ہو

کھینچے ہے دل کو زلف ہنسے گاہے نگہ سے گاہ
حیراں نہ ہووے کوئی تو اس طرز پر نہ ہو

سو دل سے بھی نہ کام چلا اس کے عشق میں
اک دل کھوں ہوں میں تو کدھر ہو کدھر نہ ہو

جس راہ ہو کے آج میں پہنچا ہوں تجھ تلک
کافر کا بھی گزار الٰہی ادھر نہ ہو

یکجا نہ دیکھی آنکھوں سے ایسی تمام راہ
جس میں بجائے نقش قدم چشم تر نہ ہو

ہر اک قدم پہ لوگ ڈرانے لگے مجھے
ہاں ہاں کسو شہید محبت کا سر نہ ہو

چلیو سنبھل کے سب یہ شہیدان عشق ہیں
تیرا گزار تا کہ کسو نعش پر نہ ہو

اُٹھ جائے رسم نالہ و آہ و فغاں سب
اس تیرہ روزگار میں تو میر اگر نہ ہو

(۷)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

چشم دل کھول اُس بھی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

نقطۂ خال سے ترا ابرو
بیت اک انتخاب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

آتش غم میں دل بھنا شاید
دیر سے بو کباب کی سی ہے

دیکھیے ابر کی طرح اب کے
میری چشم پُر آب کی سی ہے

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

(۸)

نالۂ عجز نقصِ الفت ہے
رنج و محنت کمالِ راحت ہے

تا دمِ مرگ غم خوشی کا نہیں
دلِ آزردہ گر سلامت ہے

دل میں ناسور پھر جا بجا ہے
ہر طرف کوچۂ جراحت ہے

رونا آتا ہے دم بدم شاید
کسو حسرت کی دل سے رخصت ہے

فتنے رہتے ہیں اُس کے سایہ میں
قد و قامت ترا قیامت ہے

نہ تجھے رحم نے اُسے ٹک صبر
دل پہ میرے عجب مصیبت ہے

تجھ کو مسجد ہے مجھ کو میخانہ
واعظا اپنی اپنی قسمت ہے

ایسے ہنس مکھ کو شمع سی تشبیہ
شمع مجلس کی رونی صورت ہے

ابرِ تر کے حضور پھوٹ بہا
دیدۂ تر کو میرے رحمت ہے

تربتِ میر پر ہیں اہلِ سخن
ہر طرف حرف ہی حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

(۹)

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں
تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں

برق کم حوصلہ ہے ہم بھی تو
دلکِ بے قرار رکھتے ہیں

لہ سراب ۔ دھوکہ ۔

غیر ہی موردِ عنایت ہے
ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں

نہ نگہ نے پیام نے وعدہ
نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں

ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو
لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں

چوٹٹے دل کے ہیں بتاں مشہور
بس یہی اعتبار رکھتے ہیں

پھر بھی کرتے ہیں میر صاحب عشق
ہیں جواں، اختیار رکھتے ہیں

(۱۰)

خم ہوا قد کماں سا پیر ہوئے
سو ہم اس کے نشانِ تیر ہوئے

اب نہ حسرت رہیگی مرنے تک
ہو ہم گل میں ہم اسیر ہوئے

میں ہی درویش خوار و زار نہیں
عشق میں بادشہ فقیر ہوئے

ہے شرارت کا وقت عہدِ شباب
تم لڑکپن ہی سے شریر ہوئے

گھر کو اس کے خراب ہی دیکھا
جس کے یہ چشم و دل مشیر[۱] ہوئے

شور جن کے سروں میں عشق کا تھا
وے جواں سارے پائے گیر ہوئے

یاں کی خلقت کی ہے زباں الٹی
کہتے ہیں اندھوں کو بصیر ہوئے

نہ ہوئے ہم نظیری[۲] سے یوں تو
شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے

بات کا ہم سے ان کو کب ہے دماغ
میر درویشی میں امیر ہوئے

۱۔ مشیر۔ مشورہ دینے والا ۲۔ نظیری۔ فارسی کا ایک مشہور شاعر ہے۔

(۱۱)

یاد بن تلخ زندگانی تھی — دوستی مدعی جانی تھی

لطف پر اس کے ہم نشیں مت جا — کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

شیب میں فائدہ تامل کا — سوچنا تب تھا جب جوانی تھی

میرے قصے سے سب کی نیندیں گئیں — کچھ عجب طور کی کہانی تھی

عاشقی جی ہی لے گئی آخر — یہ بلا کوئی ناگہانی تھی

سوئے قاتل سے بچ کے نکلا خضر — اسی میں اس کی زندگانی تھی

فقر پر بھی تھا میر کے اک رنگ
کفنی پہنی سو زعفرانی تھی

(۱۲)

جس جگہ دور جام ہوتا ہے — واں یہ عاجز مدام ہوتا ہے

ہم تو اک حرف کے نہیں ممنوں — کیسا خط و پیام ہوتا ہے

پوچھ مت آہ عاشقوں کی معاش — روز اُن کا بھی شام ہوتا ہے

زخم بن غم بن اور غصے بن — اپنا کھانا حرام ہوتا ہے

میر صاحب بھی اس کے ہاں تھے پر
جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

(۱۳)

دشمنی ہم سے کی زمانے نے — جو جفاکار تجھ سا یار کیا

یہ توہم کا کارخانہ ہے — یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

صد رگ جاں کو تاب دے باہم — تیری زلفوں کا ایک تار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا

(۱)

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست[1] کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوست دار دشمن[2] ہی۔ اعتماد دل معلوم — آہ بے اثر دیکھی۔ نالہ نارسا پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے۔ آج ہم نے اپنا دل — خوں کیا ہوا دیکھا۔ گم کیا ہوا پایا

حال دل نہیں معلوم لیکن اسقدر یعنی — ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

شور پند ناصح نے۔ زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے۔ تم نے کیا مزا پایا

(۲)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم۔ تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے؟ اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا۔ کہ بندھا تھا عہد بودا — کبھی تو نہ توڑ سکتا۔ اگر استوار[3] ہوتا

۱؎ زیست۔ زندگی۔ ۲؎ دوست دار دشمن۔ دشمن کو دوست رکھنے والا۔ ۳؎ استوار۔ مضبوط۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش[1] کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی؟ جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے؟ کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غمگسار ہوتا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو۔ یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل[2] ہے۔ پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا۔ غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا؟ اگر ایک بار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی۔ تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف! یہ ترا بیان غالب!
تجھے ہم ولی سمجھتے۔ جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۴)

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ۔ درخور[3] محفل نہیں رہا

مرنے کی۔ اے دل۔ اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت[4] در آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا، رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشت وفا[5] مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا۔ مگر۔ اسد
جس دل پہ ناز تھا۔ مجھے وہ دل نہیں رہا

۱۔ تیر نیم کش۔ وہ تیر جسے چھوڑتے وقت کماندار نے پورا نہ کھینچا ہو۔ ۲۔ جاں گسل جان کو گھلانے والا ۳۔ درخور۔ دخل ۴۔ شش جہت۔ چھ سمتیں ۵۔ کشت وفا۔ آرزوئے وفا

(۴)

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہیگا کچھ نہ کچھ۔ گھبرائیں کیا؟

لاگ[۱] ہو۔ تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ[۲]
جب نہ ہو کچھ بھی۔ تو دھوکا کھائیں کیا؟

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب۔ اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟

موج خوں۔ سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا؟

پوچھتے ہیں وہ کہ "غالب کون ہے؟"
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(۵)

دیوانگی سے دوش پہ زنار[۳] بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

مٹنا ترا اگر نہیں آساں۔ تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے۔ کہ دشوار بھی نہیں

ہے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے۔ اور یہاں
طاقت بہ قدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی[۴] کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی[۵]
حال آں کہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۱ لاگ۔ دشمنی ۲ لگاؤ۔ محبت ۳ زنار۔ دھاگا۔
ورد۔ جنیو۔ ۴ شوریدگی۔ دیوانگی ۵ روکشی۔ مقابلہ

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہشیار بھی نہیں

(۶)

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا — بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤگے غالبؔ؟
شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۷)

تمام سوالیہ ہے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ "مدعا کیا ہے؟"
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے۔ وفا کیا ہے؟

ہاں بھلا کر۔ ترا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے؟

جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا۔ دعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ۔ کچھ نہیں۔ غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

(۲)

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے" تمہیں کہو۔ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ۔ نہ برق میں یہ ادا کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ہماری جیب کو۔ اب حاجت رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں۔ دل بھی جل گیا ہو گا کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا۔ تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز سوائے بادۂ گلفام مشکبو۔ کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقت گفتار، اور اگر ہو بھی تو کس امید پہ کہیے کہ "آرزو کیا ہے"

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہی اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

(۹)

حسنِ مہ، گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال[1] اچھا ہے

بے طلب دیں، تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا، جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ "سال اچھا ہے"

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

(۱۰)

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر[2]
جائے مے[3] اپنے کو کھینچا چاہیے

[1] جام سفال۔ مٹی کا پیالہ (مراد آبخورہ)۔ [2] حذر۔ پرہیز۔ علیحدگی۔ [3] جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے۔ کھینچنا چاہیے یہاں دو معنی میں مستعمل ہے ایک معنی معروف جو فعل کشیدن کا ترجمہ ہے دوسرے بہ معنی پرہیز کرنا۔

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایام گل کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے
دشمنی نے میری. کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے؟ دیکھا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
غافل. ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو. اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

(۱۱)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت. تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے. تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ اے وہ مجلس نہیں. خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں؟ نہ سہی عشق. مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل. تو حسرت ہی سہی

(۱۲)

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار[1] ہیں اکثر نجوم[2]
وہ بلائے[3] آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(۱۳)

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کماں کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں۔ اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ؟
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا۔ خضر نے سکندر سے؟
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

[1] اعمار جمع عمر کی قاطع اعمار، مار ڈالنے والا، مہلک [2] نجوم جمع نجم بمعنی ستارہ۔ [3] بلائے آسمانی مراد ستمہائے معشوق۔

میر محمد تقی میر

میر تقی اردو شاعری میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ وہ غزل گو شعراء کے سرتاج ہیں۔ میر کی زندگی کے حالات اب سے چند سال پہلے تک بحث طلب اور اختلافی تھے۔ لیکن ان کی خود نوشتہ سوانحعمری "ذکر میر" کی اشاعت سے بہت سے تصفیہ طلب مسائل طے ہو گئے۔ جدید ترین تحقیقات کی بناء پر ان کی پیدائش اکبر آباد (آگرہ) میں سنہ ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۲ء) میں ہوئی۔ والد کا نام محمد علی تھا جو ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ میر صاحب نے تصوف کی تعلیم اُن سے ہی حاصل کی اس لئے بچپن سے درویشوں اور صوفیوں کی صحبت پسند ہوئی۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ سوتیلے بھائیوں اور عزیزوں نے ان کے ساتھ محبت کا سلوک نہیں کیا۔ اس لئے دل برداشتہ

ہو کر دہلی چلے آئے۔ اور اپنے عزیز سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس رہنے لگے۔ خان آرزو فارسی اور اُردو کے زبردست شاعر تھے اور اُردو کے اکثر شاعر اُن کے شاگرد تھے۔ اس ماحول میں میر صاحب کو بھی شعر گوئی کا شوق ہوا، اور دہلی سے اس کا آغاز ہوا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد خان آرزو سے اَن بَن ہو گئی اور یہ زمانہ ان پر بہت سخت گزرا تلاشِ معاش میں دربدر بھٹکتے پھرے۔ آخر کار دہلی کو الوداع کہا اور نواب آصف الدولہ کی طلب پر لکھنؤ چلے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں بھی تیرہ بختی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آخر عمر نہایت عسرت اور تنگدستی میں بسر ہوئی۔ ذکر میر کے خاتمہ کی عبارت پڑھنے سے آج بھی دل بھر آتا ہے۔ میر صاحب اپنے آلام اور مصائب کا ذکر کرتے ہوئے درد ناک انداز میں مرنے کی تمنا کرتے ہیں۔ ان کی یہ آرزو ۱۲۲۵ھ / ۱۸۰۸ء میں پوری ہوئی۔ لکھنؤ میں ہی دفن ہوئے لیکن مرنے کے بعد بھی یہ بدنصیبی قابل غور ہے کہ اُن کے مزار کا پتہ نہیں۔ بعض لوگوں نے بزرگوں کی روایات سُن کر آغا میر کی ڈیوڑھی میں ایک چبوترے پر ان کا مزار بنا دیا ہے — اُن کے کلام کو جو شہرت اور قبول عام حاصل ہوا وہ اُردو شاعری کی تاریخ میں اور کسی کو نصیب نہیں۔

اُن کے کلام کی سب سے بڑی خوبی سادگی ہے۔ زبان سادہ اور بیان سادہ کا جو نمونہ اُن کے کلام میں ملتا ہے۔ وہی سہل ممتنع ہے اس وصف خاص میں کسی شاعر کا کلام ان سے بازی نہیں لے جا سکا۔ لیکن

اس سادگی نے کلام کو پھیکا اور بے مزہ نہیں کیا۔ جوش ان کی شاعری کی دوسری نمایاں خصوصیت ہے۔ اور اسی لئے ہر شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اُن کے کلام پر رائے دیتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ "ان کا کلام تیز نشتر کی طرح ہے جو فوراً دل کی گہرائی میں پہنچ کر کھٹکنے لگتا ہے" ان کی تمام زندگی آلام و مصائب میں گزری تھی اس لئے قدرتی طور پر یاس و حسرت کے مضامین اُن کے کلام میں بکثرت ہیں۔ دنیا کے بے ثباتی اور ناپائیداری کے جیسے نادر مضامین ان کے یہاں ملتے ہیں اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ تصوف سے گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے عشق حقیقی اور معرفت الٰہی کے مضامین ان کے کلام میں اور بھی گرمی اور تیزی پیدا کرتے ہیں۔ ان مضامین میں بھی سوائے ایک خواجہ میر درد کے کوئی ان کے پایہ کو نہیں پہنچتا۔ شاعری میں ان کے ان کمالات کو قدیم و جدید شاعروں نے تسلیم کیا ہے۔ اس اعتبار سے اپنے کلام کے متعلق ان کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔

تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا ۔۔۔ جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز

خصوصیات کلام میر کی شاعری اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے اُردو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

خصوصیات (۱) الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔

(۲) پیرایۂ بیان عمدہ ہونے کی وجہ سے شعر کا رتبہ نہایت بلند ہو جاتا ہے۔

(۳) کلام بے حد پُر درد ہے کہ پڑھنے سے دل پر چوٹ لگتی ہے لیکن لطف سے خالی نہیں۔

(۴) زبان کی فصاحت اور سادگی، سوز و گداز، مضامین کی جدت اور تاثیر یہ ایسی خوبیاں ہیں جو اُردو کے بہت کم شعراء میں پائی جاتی ہیں۔

(۵) ان کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی، صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ہیں جس پر ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان کر دی جائیں۔

(۶) اُن کا کلام دور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغے اور ما فوق العادات امور سے پاک ہے۔

(۷) بھونڈے اور بیجا تکلف و تصنع اور فضول لفاظی کا نام نہیں۔

(۸) قلبی واردات اور کیفیات کو نہایت سادہ پیرایہ میں

اور نہایت شستہ اور صاف زبان میں ایسے دلکش اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنی چاہتے ہیں وہ دل میں اتر جاتی ہے۔

(۹) بلحاظ فصاحت و روانی ان کا کلام سہل ممتنع ہے۔

(۱۰) شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اس کے کلام کی تاثیر ہے اگر اس معیار پر میر کا کلام جانچا جائے تو اُن کا رتبہ اُردو شعرا میں سب سے اعلیٰ نکلے گا۔ کیونکہ ان کے اشعار سوز و گداز اور درد کی مکمل تصویریں ہیں جو زبان سے نکلتے ہی دل میں جا کر نقش ہو جاتی ہیں۔
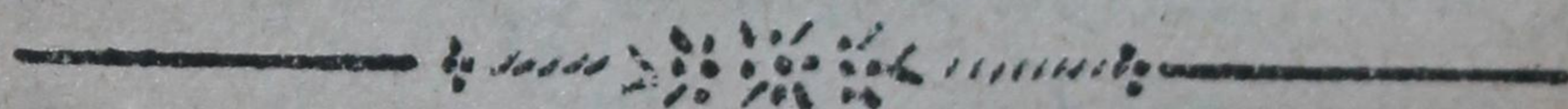
مرزا اسد اللہ خاں غالب

نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ مرزا اسد اللہ خاں جن کا لقب مرزا نوشہ تھا اُردو شاعروں کی صفِ اول میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ اُن کی ولادت اکبر آباد (آگرہ) میں سنہ ۱۷۹۶ء میں ہوئی۔ والد کا نام عبد اللہ بیگ خاں تھا جو الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت میں تھے۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں کسی لڑائی میں کام آئے اور مرزا کو داغِ یتیمی نصیب ہوا والد کے انتقال کے بعد چچا نصر اللہ بیگ خاں نے پرورش کی لیکن ان کا بھی چند سال بعد انتقال ہو گیا۔ ان کی پینشن میں سے مرزا کو بھی اپنا حصہ ملا۔

مرزا کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی دختر سے دہلی میں ہوئی، اس تعلق سے دار السلطنت میں آنا جانا ہوتا رہا۔ اور آخر کار وہی وطن قرار پایا، یہاں شاعری اور ان کے کمالات نے بہت جلد انھیں بلند ترین مراتب تک پہنچا دیا۔ تا آں کہ سنہ ۱۸۵۴ء میں ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے انہیں اپنا استاد مقرر کیا اور علاوہ خلعت کے پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ منظور ہوا ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ انہوں نے اپنی

آنکھوں سے دیکھا اور اس کے چرکے سہے اس زمانے میں فکر معاش نے انہیں بے حد پریشان رکھا۔ دربار رامپور کے ماہانہ عطیہ اور قرض ادھار پر گذر کرتے رہے۔ دوڑ دھوپ کے بعد پنشن جو زمانہ غدر میں بند ہوگئی تھی دوبارہ جاری ہوگئی ۱۸۶۹ء میں دہلی میں وفات پائی اور بستی نظام الدین اولیاء میں دفن ہوئے۔

مرزا اردو شاعروں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو شاعری کا رشتہ براہ راست فارسی شعرا سے جوڑا۔ اپنے کلام کے پہلے دور میں وہ اردو شاعری اور شعراء کی روایات سے بالکل بے خبر نظر آتے ہیں اور فارسی کے مشہور شعرا مثل بیدل و صائب، کلیم، ظہوری کا اپنی نظم و نثر میں متبع کرتے ہیں۔ خاص کر مرزا بیدل کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اس کے بعد ایک ایسا دور گزرا کہ اردو کا کلام بہت کم لکھا۔ لیکن ۱۸۵۰ء میں ظفر کی استادی کا شرف حاصل ہوتے ہی شاعری پر ایک نیا اثر پڑا۔ قلعہ معلی میں استاد ذوق مرحوم کی بدولت شاہ نصیر کا رنگ مقبول تھا۔ انھیں بھی وہی انداز اختیار کرنا پڑا لیکن طبیعت غیور اور جدت پسند تھی۔ اس لئے شاعری میں اپنی شاہراہ بہت جلد الگ نکالی۔

مرزا غالب کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی خیال کی بلندی ہے اس میں جہاں کہیں وہ حد سے تجاوز کرتے ہیں کلام مغلق ہو کر معمہ بن جاتا ہے۔ دور اول میں ایسے نمونے بکثرت ملتے ہیں لیکن جہاں سلامتی طبع ان کا ساتھ دیتی ہے اور بلند پروازی میں اعتدال ملحوظ رہتا ہے

وہاں ان کا کلام نادر ہوتا ہے۔ وہ فارسی کے عاشق تھے اس لئے فارسی کی نزاکت اور شیرینی اردو میں منتقل کرنے کی کوشش ہر جگہ نظر آتی ہے۔ بالخصوص بہت سی نئی ترکیبیں اور تشبیہیں جو پہلے پہل انھوں نے استعمال کی ہیں جو اس زبان میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ لیکن غالب کے کلام کا اصلی جوہر وہاں کھلتا ہے جہاں وہ دنیا کے حقائق و معارف اور فطرت انسانی کے وسیع مطالعہ سے اپنے تاثرات نظم کرتے ہیں یہی حصہ ان کے کلام کا غیر فانی عنصر ہے۔ اس میں سوز و گداز بھی ہے اور طنز و ظرافت بھی، تصوف بھی ہے اور دنیا کے مسائل پر فلسفیانہ اور مفکرانہ غور و فکر بھی، رندی و شاہدی کے مضامین بھی ہیں، اور اخلاق پند و نصائح کے دفتر بھی، غرض ان کے ساز میں ہر راگ اور راگ میں ہر بول ہے۔ غالباً ایسی جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے بعض ناقدین نے دیوانِ غالب کو ہندوستان کی ایک الہامی کتاب قرار دیا ہے۔

خصوصیات کلام

(۱) مرزا کے قصر شاعری کی مستحکم بنیاد اُن کی جدت طرازی پر قائم ہے۔ جس میں جدت تخیل، جدت طرز ادا جدت تشبیہات، جدت استعارات، جدت الفاظ غرضکہ ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں اور انھیں وجوہ سے پامال مضامین غالب کی خاص طرز ادا سے بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) استعارات کی جدت اور تشبیہات کی ندرت سے غالب کے کلام میں ایک چمن زار نظر آتا ہے۔

(۳) خواجہ حافظ کا سا جوش اگر کسی کے کلام میں ہے تو وہ غالب ہی میں ہے۔

(۴) غالب نے درد و غم۔ حسرت و تمنّا اور یاس و ناکامی کے مضامین میں میر کا تتبع کیا ہے۔

(۵) حُسنِ معانی کے ساتھ ساتھ غالب کا کلام حُسنِ الفاظ حُسنِ بندش اور حسنِ ترکیب کا بھی بہترین نمونہ ہے۔

(۶) صنائع بدایع بہت کم ہیں لیکن رعایت لفظی نمایاں ہے۔

(۷) عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً دیگر شعراء کے یہاں پائی جاتی ہیں غالب ان سے بچکر نکلتے ہیں۔

(۸) متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کرتے ہیں۔

(۹) اُن کی طرزِ ادا میں ایک خاص شے مضمر رہتی ہے اور کلام کا پہلو ایسا ہوتا ہے کہ بادی النظر میں کچھ مفہوم ہوتا ہے۔ مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں اور ایسی خصوصیت کو معمے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۱۰) وہ اپنے اشعار کے ذریعے سے اپنی دلی کیفیات اپنا کلام پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی حرماں نصیبی، ہجومِ ناامیدی مصائب سعی لاحاصل، دنیا سے تنفر و بیقراری وغیرہ۔

(۱۱) مرزا ایک بہت بڑے فلسفی تھے" اور ان کے اشعار اکثر حقائق، فلسفہ کو آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا رموز و حقائق تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل آزاد ہیں۔

(۱۲) مرزا کی شاعری میں گوکہ مایوسی اور درد کی کثرت ہے لیکن پھر بھی طبعی ظرافت اور شوخی اکثر نمایاں ہو جاتی ہے۔ مگر اُن کی ظرافت کبھی حدِ اعتدال سے نہیں بڑھتی اور متین سے متین آدمی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔